امراؤ جان ادا

ہماری زبان میں ایک ناول ایسا بھی ہے، جسے خاصے کی چیز سمجھا جاتا ہے، لیکن جس کی طرف ابھی تک کوئی توجہ نہیں کی گئی۔

غالباً اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اسے محض ایک طوائف کی دلچسپ کہانی سمجھ کر پڑھا جاتا رہا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے بنیادی اور قابلِ قدر پہلو نظر سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ''امراؤ جان'' ناول میں ایک اہم کردار کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہی اس ناول کا موضوع بھی ہو۔ ناول کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے ضروری

ہے کہ پہلے اس کے موضوع کو دریافت کیا جائے، یہ اس لیے کہ ہر موضوع چند مخصوص امکانات رکھتا ہے اور اس کے اپنے تقا ہوتے ہیں۔ ناول نگار کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ ان امکانات کو بروئے کار لائے، ان تقاضوں کو پورا کرے اور فطرت کی ان لہرو بہتا ہوا دکھائے جو واقعات اور کرداروں کی ساخت پرداخت کرتی ہیں۔ موضوع سے واقفیت حاصل کرنے کے معنی یہ ہوتے ہیں ہم فن کے مطالبوں کو پا گئے ہیں اور ان کی کسوٹی پر تفصیل، تصادم اور ترجمانی کے عمل کو پرکھ سکتے ہیں، للہذا ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ناول کا موضوع کیا ہے؟

رسوا ابتدا ہی میں ہمارا تعارف امراؤ جان سے اس طرح کراتے ہیں:

"اسی کمرے کے برابر ایک کمرہ تھا۔ اس میں ایک طوائف رہتی تھی۔ بود و باش کا طریقہ اور رنڈیوں سے بالکل علیحدہ تھا نہ کمرہ پر کسی نے سرِ راہ بیٹھے دیکھا نہ وہاں کسی کی آمد و رفت تھی۔ دروازوں پر دن رات پردے پڑے رہتے تھے۔ چوک کی طرف نکاس کا راستہ بالکل مقفل رہتا تھا۔ گلی کی جانب ایک اور دروازہ تھا۔ اسی سے نوکر چاکر آتے جاتے تھے۔ اگر کبھی کبھی رات کو گانے کی آواز نہ آیا کرتی تو یہ بھی نہ معلوم ہوتا کہ اس کمرے میں کوئی رہتا بھی ہے یا نہیں۔ جس کمرے میں ہم لوگوں کی نشست تھی۔ اس میں ایک چھوٹی سی کھڑکی لگی تھی۔ مگر اس میں کپڑا پڑا ہوا تھا ... اتنے میں میں نے ایک شعر پڑھا۔ اس کھڑکی کی طرف سے واہ کی آواز آئی۔ میں چپ ہو گیا ... منشی محمد حسین نے پکار کر کہا: "غائبانہ تعارف ٹھیک نہیں"۔ ...

ابھی قصہ شروع نہیں ہوا ہے، نہ مرزا نے مشاعرے کی محفل جمائی ہے۔ ہم امراؤ جان کے ہمسائے میں لے جائے گئے ہیں۔ اتنے میں رسوا ہمیں پاس آنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ ہم رسوا کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر درز سے جھانکتے ہیں اور ہمیں امراؤ جان کے بارے میں چند ضروری باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔

اس کے بعد امراؤ جان مشاعرے میں آتی ہیں یا ترغیب دے کر لائی جاتی ہیں اور اپنی غزل پیش کرتی ہیں۔

منشی صاحب : اچھا وہ مطلع کیا تھا؟

امراؤ جان : میں عرض کیے دیتی ہوں ؎

کعبے میں جا کے بھول گیا راہ دَیر کی
ایمان بچ گیا مرے مولا نے خیر کی

منشی صاحب : خوب کہا ہے!

خان صاحب : اچھا مطلع کہا ہے۔ مگر یہ ''بھول گیا'' کیوں؟

امراؤ جان : تو خان صاحب! کیا میں ریختی کہتی ہوں؟

اب وہ عبارت دیکھیے جہاں اصل قصّے کا آغاز ہوتا ہے۔

''ہاں اتنا جانتی ہوں کہ فیض آباد میں شہر کے کنارے کسی محلّے میں میرا گھر تھا۔ میرا مکان پختہ تھا۔ آس پاس کچھ کچّے مکان۔ کچھ جھونپڑے، کچھ کھپریلیں، رہنے والے بھی ایسے ہی ویسے لوگ ہوں گے۔ میرے ابّا، بہو بیگم صاحب کے مقبرے پر نوکر تھے ... ابّا جب شام کو نوکری پر سے آتے تھے، اس وقت کی خوشی ہم بھائی بہنوں کی کچھ نہ پوچھیے۔ میں کمر سے لپٹ گئی۔ بھائی ابّا ابّا کر کے دوڑا، دامن میں چھُپ گیا۔ ابّا کی باچھیں مارے خوشی کے کھلی جاتی ہیں..... دلاور خاں کا مکان ہمارے مکان سے تھوڑی دور پر تھا۔ مُوا ڈکیتوں سے ملا ہوا تھا..... ابّا سے سخت عداوت تھی۔''

ان اقتباسات سے ہمیں امراؤ جان کے آغاز اور انجام دونوں سے متعلق چند ضروری خبریں مل جاتی ہیں۔ پیدائش کے بعد اور موت سے پہلے وہ کیا ہے؟ کس ماحول میں اس نے اپنی آنکھیں کھولیں؟ اور اب کس منزل پر آن کر ٹھہر گئی ہے۔ یہی نہیں، بلکہ ہمیں خفیف سا اندازہ ان بھول بھلیّوں کا بھی ہو جاتا ہے۔ جن سے امراؤ جان کو گزرنا پڑا ہوگا اور ان چھوٹی چھوٹی نرم گرم کہانیوں کا بھی جن کا تانا بانا ایک خوش مذاق طوائف کے گرد بُنا جا سکتا ہے۔ گویا مرزا صاحب قصّے کے ترتیبی منظر اور اس کی تمہید ہی میں ہمیں اُمراؤ جان اداؔ سے اس طرح متعارف کرا دیتے ہیں کہ اس کی زندگی میں کوئی راز باقی نہیں رہتا۔ نہ ہمارے دل و دماغ میں تجسّس کی کوئی اونچی لہر اٹھتی ہے اور نہ ہمیں اس بات کی توقع ہوتی ہے کہ آئندہ چل کر اس کی زندگی میں کچھ ایسے انکشافات آئیں گے جو ہماری تسکین کا باعث اور تحیّر کا سامان ہوں گے۔ اوپر دیے ہوئے اقتباسات کی مدد سے ہم کتنی منزلیں طے کر جاتے ہیں۔ امراؤ جان ایک طوائف تھی، اب تائب ہو چکی ہے، شعر و سخن کا ذوق رکھتی ہے۔ ادب کے چند اصناف سے واقف ہے۔ خود شاعر ہے۔ بچپن ایک شریف متوسّط گھرانے میں گزرا۔ یہاں اس کا نام امراؤ جان نہیں کچھ اور ہوگا۔ دلاور خاں کی اس کے باپ سے دشمنی تھی۔ اسی نے اس معصوم کو گھر کی چار دیواری سے نکال کر ایک ایسی دنیا میں پھینک دیا، جہاں دوزخ مہکتے ہیں اور فردوس خاموش ہیں۔

اس خاکے پر ہماری آنکھیں جم نہیں جاتیں اور ہم اس کی تہوں کو کھولنے اور اس کے بھیدوں کو ٹٹولنے کے بجائے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

مگر اس سے پہلے کہ ہم نگاہ کے دامن کو دور تک پھیلائیں، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک مقام اور دیکھتے چلیں۔ البتہ

اس کے لیے جست لگانا ضروری ہے۔ یہ وہ جگہ ہے، جہاں کہانی تین چوتھائی ہو چکی ہے۔ امراؤ فیض آباد میں ہے۔ صدیوں
زمانے نے ایک ایسی کروٹ لی ہے کہ سخت دست ہموار ہو گئے ہیں۔ غدر کی آگ دب چکی ہے مگر کہیں کہیں چنگاریاں اٹھتی دکھ
دیتی ہیں۔ امراؤ جان زندگی کی گردان کیے جا رہی ہے۔ اپنے وطن میں ہے، مگر سب کے لیے بیگانہ ہے۔

(خورشید الاسلام